ناصر کاظمی: وہ ہجر کی رات کا ستارہ!

نایاب حسن قاسمی

22/A سیما اپارٹمنٹ، گراؤنڈ فلور، گلی نمبر 7، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025، موبائل: 9560188574

تقسیمِ ہند اور ہجرت کے نتیجے میں برصغیر کے بے شمار آباد گھرانے ویران ہوئے اور اَن گنت ہنستے کھیلتے خاندان شکست و ریخت سے دوچار ہوئے، وہ دور ایسا تھا کہ حساس ذہنوں اور بیدار دماغوں پر قیامت برپا کر گیا۔ ناصر کاظمی (۱۹۲۵ء – ۱۹۷۲ء) اس وقت نوجوان تھے، انبالہ ان کا وطن تھا اور وہیں رہتے تھے، حالات کی ستم ظریفی نے انھیں بھی ہجرت پر مجبور کیا اور وہ انبالے سے لاہور جا پہنچے، مگر اپنے وطن اور وطن والوں کی یاد انھیں پیہم ستاتی رہی، ان کا دل ایک رنجِ رائیگانی تلے دبا رہا، جس کا اظہار وہ تاحیات اپنے ذہنی و عملی رویوں اور ادبی و شعری تخلیقات میں کرتے رہے۔ ناصر نے بنیادی طور پر ہجرت کے کرب کو مختلف زاویوں سے شاعری کا موضوع بنایا اور حسن و عشق کے روایتی عنوانِ غزل کو بھی نیا پیرایۂ اظہار دیا، بلکہ ان کے ذریعے اردو غزل کو موضوعاتی، لفظیاتی و معنوی اعتبار سے ایک نئی سمت ملی، اس کے اسلوب میں دل آویزی اور مضامین میں تنوع پیدا ہوا۔ ناصر نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے اشعار کے ذریعے کیا، جو الفاظ کی بندش اور تراکیب کے اعتبار سے نہایت سہل تھے، مگر ان کی معنیاتی سطح میں گہرائی و گیرائی تھی، نتیجتاً ان کے اشعار آن کی آن میں قارئین کے دلوں میں کھب جاتے اور لوگ سنتے ہی انھیں آویزۂ گوش بنا لیتے۔ ناصر کی شاعری میں ایک عجیب قسم کی معصومیت، سادگی اور ایسی بے ساختگی ہے، جو اس میں طربناکی و سحر انگیزی پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں بیتے دنوں کا عکس اور گزشتہ واقعات واحوال کا نقش جابجا بکھرا ہوا ہے، اُن دِنوں کو وہ بڑی افسردگی سے یاد کرتے ہیں، جن کا ساتھ چھوٹ گیا اور ان عزیزوں کی گم شدگی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں، جو ایک عظیم سیاسی سانحے کی نذر ہو گئے:

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انھیں کہ آسمان کھا گیا

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصرؔ
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

پھر یہ ہوا کہ ''اُداسی'' ناصر کاظمی کی شاعری کا شناخت نامہ بن گئی، البتہ اس اداسی میں بھی ایک دل آویزی اور دلکشی تھی۔ خاص کر حرماں نصیبی و بے بسی کے مختلف رنگوں اور کیفیات کی منظر کشی ناصر نے بڑے دلنشیں انداز میں کی ہے اور ان کے ایسے اشعار میں بلا کی تاثیر ہے۔ اداسی حقیقی معنوں میں ایک تکلیف دہ کیفیت کا نام ہے، ناصر کاظمی نے بھی عموماً اپنے شعروں میں اداسی کے اسی پہلو کی عکاسی کی ہے، مگر بار بار اس کے مختلف مظاہر کا ذکر کرکے اور خوش رنگ الفاظ و خیال کے پیراہن میں اسے پیش کرکے اس میں ایک رومانویت اور کشش پیدا کر دی ہے، ان کے بعض اشعار کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اداسی بھی کوئی مزے دار و سرور بخش کیفیت ہے اور اس سے لطف لینا چاہیے، مثلاً:

اپنی دُھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں

اپنی لہر ہے اپنا روگ
دریا ہوں اور پیاسا ہوں

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

چپ چپ کیوں رہتے ہو ناصرؔ
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے

معاملاتِ حسن وعشق میں ہجروفراق ایک کرب انگیز واقعہ ہے اورغزل کے شعراجہاں وصال کی شادکامیوں کواپنے وسیع ،متنوع وحسین خیالات کے زور پرخوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں،وہیں جدائی کی تشریح وتعبیر میں بھی ان کا زورِتخیل خوب کام کرتا ہے۔ناصر کاظمی نے ہجراوراس سے متصل مختلف کیفیات کواپنے اشعار میں بیان کیا ہے،ان کیفیات کاایک رنگ تووہ ہے جواوپر کے اشعار میں مذکورہوااور کچھ دوسرے رنگ ملاحظہ فرمائیں:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

خیر تجھے تو جانا ہی تھا
جان بھی تیرے ساتھ چلی ہے

مذکورہ تینوں اشعار میں تین مختلف کیفیتیں بیان کی گئی ہیں۔پہلے شعر میں محبوب کی رفاقت سے محرومی اورمحبت سے دامن کشی کے باوجود محبوب کی ضرورت کے احساس کا ذکر ہے۔دوسرے شعر میں فراقِ یار کے رنج وغم کی شدت یوں بیان کی ہے کہ محبوب کا جانا تو خیر مقدر ہی تھا،مگراس کے جانے کے ساتھ ایسا لگتا ہے میری جان چلی جاتی ہے۔تیسرے شعر میں یاس،قنوطیت اور ناامیدی کی کیفیت کے ساتھ ایک امید موہوم کا اظہار ہے کہ محبوب کی دوری ومہجوری گوکہ ایک حقیقت ہے،مگردل پھر بھی منتظر ہے کہ شایدوہ لوٹ آئے۔پروین شاکر نے اس کیفیت کواپنے مخصوص نسائی لہجے میں یوں بیان کیا ہے:

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

دوسرے کئی اشعار میں اس کے بالکل اُلٹ خیالات کا اظہار کیا ہے۔محبوب سے جدائی پرگریہ وزاری اور ہائے وائے کرنے کے بجائے اس سانحے سے بے نیازانہ گزرنے کی تلقین کی ہے:

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں!

ایک کیفیت یہ ہے کہ انقلاباتِ زمانہ اور سانحاتِ زندگی اس کی فرصت ہی نہیں دیتے کہ محبوب سے جدائی کا غم سنجوکر رکھا جائے،انسان کے شخصی حالات اس تواتر سے پلٹا کھاتے ہیں کہ وہ غمِ یار سے نکل کر غمِ روزگار سے دوچار ہوجاتا ہے۔یہ ایک سچائی ہے اورتقریباً ہرحساس انسان جہاں عمر کے ایک مرحلے میں جذباتی وابستگی کے طوفان بدوش احوال سے گزرتا ہے،وہیں اس پر بیتنے والے حقیقی واقعات وحالات کے تھپیڑے اس طوفان کو ہباءً منثوراً کردیتے ہیں:

جدائیوں کے زخم دردِ زندگی نے بھر دیے
تجھے بھی نیند آ گئی،مجھے بھی صبر آ گیا

تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

ایک کیفیت یہ بھی ہے:

کہیں ملا تو کسی دن منا ہی لیں گے اسے
وہ زود رنج سہی پھر بھی یار اپنا ہے

اور یہ شعر تو کمال کا ہے،ہجروفراق کی ساری داستان گویا ہمارے شاعر کی خیال آرائیوں کا کرشمہ ہے،جدائی بھی اپنی ہے اورانتظار بھی اپنا ہے،اپنا آپ ہی جداہوا ہے اوراسی کی واپسی کے منتظر ہیں:

وہ کوئی اپنے سوا ہو تو اس کا شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے

غالباً اسی وجہ سے ناصر کاظمی کے خاص دوست انتظار حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں حسن وعشق اور ہجروصال کی جن کیفیات وواردات کو بیان کیا ہے،ان کا قارئین کی زندگیوں سے تعلق ہوتو ہو؛لیکن ناصر کی حقیقی زندگی سے ان اشعار کا تعلق نہیں ہے،وہ محض شاعرانہ تخیل کی کام جوئیوں کا نتیجہ ہے۔وہ خود پرایسی کیفیات طاری کیے رہتے تھےاورانہی کے زیراثر اشعار کہتے تھے۔ڈاکٹرحسن رضوی نے اپنی کتاب''وہ تیراشاعر،وہ تیرا ناصر'' (ط:سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۶ء)میں ناصر کاظمی کی چھوٹی بحروں کی مسلسل غزلوں کے مجموعے ''پہلی بارش'' کی وجہِ نزول بیان کرتے ہوئے ان غزلوں کا حقیقی مصداق متعین کرنے اورناصر کی زندگی میں جذباتی وابستگی کی کارفرمائیوں کی جستجو کرنے کی کوشش کی ہے،جسے انتظار حسین نے اسی کتاب کے پیش لفظ میں''فضول'' قراردیا ہے اورلکھا ہے کہ''شاعری کو سمجھنے کا یہ بہت سطحی طریقہ ہے''۔حالاں کہ اسی پیش لفظ میں انتظار صاحب نے یہ بھی لکھا ہے

کہ ناصر کے یہاں واقعہ اور تخیل اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے، گویا اس کا بھی امکان ہے کہ ناصر کاظمی نے غزلیہ شاعری میں جن احوال وواردات کا اظہار کیا ہے، وہ ان کی اپنی سرگزشت ہو۔

ناصر نے عرصۂ وصال کی بھی بڑی دل آگیں تصویر کشی کی ہے۔ پہلی بارش کی ایک مسلسل غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اِک رخسار پہ زلف گری تھی
اِک رخسار پہ چاند کھلا تھا
ٹھوڑی کے جگ مگ شیشے میں
ہونٹوں کا سایا پڑتا تھا
چندر کرن سی انگلی انگلی
ناخن ناخن ہیرا سا تھا

ایک کیفیت یہ ہے کہ وصال میں بھی دل پر بے قراری اور اَن جانا ہراس طاری رہتا ہے اور اس نعمت سے شاد کام ہونے کے بجائے کسی اَنہونی کے اندیشے میں مبتلا رہتا ہے:

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

حتیٰ کہ محبوب کا تصور بھی بسا اوقات ذہن و دھیان پر لرزہ طاری کر دیتا ہے:

یوں ترے دھیان سے لرزتا ہوں
جیسے پتے ہوا سے ڈر جائیں

''تنہائی'' بھی ناصر کاظمی کی شاعری میں منفرد کیفیات کا استعارہ ہے۔ جب گرد و پیش میں ہو کا عالم ہوتا، آس پاس کسی متنفس کا نشان نہ ملتا، چہار جانب صرف تنہائی ہوتی، تو تنہائی کے اس خاموش وسنسان جنگل میں ہمارے شاعر کی تخلیقی رگ پھڑک اٹھتی اور پھر وہ اپنے خیال کی موج میں بہنے لگتا، اسے یوں لگتا کہ آس پاس، چاروں طرف، دور دور تک گھنی زلفوں کے سایے ہیں، جسم وروح پر دلدار نظروں کی رومان انگیز پھواریں پڑ رہی ہیں، رخساروں کے گلاب کھل رہے اور بولتے ہونٹوں کی شراب اُبل رہی ہے، بس اس تصور سے اس پر کیف وخمار طاری ہو جاتا، پھر ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت غزلیں اور اشعار اس کی بارگاہِ تخلیق میں سجدہ ریز ہوتے۔ تنہائی اس کی مجبوری بھی تھی اور قوت بھی، تنہائی اس کا پائے شکستہ بھی تھی اور دستِ دعا بھی، دکھ کی گھڑیوں میں تنہائی اس کے لیے دلاسہ تھی اور سامانِ تسلی، تنہائی میں اسے مخصوص قسم کی قداست نظر آتی، ایسی جو یادِ خدا میں لپٹی ہوتی۔ تنہائی اس کے دل کی جنت تھی اور اول وآخر اسے تنہائی سے عشق تھا:

چھوڑ گئے جب سارے ساتھی
تنہائی نے ساتھ دیا تھا
سوکھ گئی جب سکھ کی ڈالی
تنہائی کا پھول کھلا تھا
تنہائی میں یاد خدا تھی
تنہائی میں خوفِ خدا تھا
وہ جنت مرے دل میں چھپی تھی
میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا
تنہائی مرے دل کی جنت
میں تنہا ہوں میں تنہا تھا

ناصر کے دوستوں نے لکھا ہے کہ عموماً ان پر عجیب محویت اور ازخود رفتگی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ سردی ہو یا گرمی، رات کے سناٹوں میں وہ تن تنہا لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں پھرا کرتے اور اپنی تخلیقی سیرابی کا سامان کرتے، دیر رات اپنے گھر پہنچتے، ان کی اہلیہ دروازہ کھولتیں، وہ گھر میں داخل ہوتے، ڈائری میں تازہ وارد ہونے والی غزل لکھتے اور بستر پر دراز ہو جاتے۔ رات کے سناٹوں اور تاریکی میں بھی انھیں کوئی ایسا حسن نظر آتا تھا، جسے وہ تن تنہا محسوس کرنا چاہتے، ان کی اپنی زندگی کا ماضی وحال بھی اس تاریکی اور سناٹے میں ان کے پردۂ ذہن پر روشن ہو جاتا، پھر وہ ڈوب کر شعر کہتے:

رات کتنی گزر گئی لیکن
اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں

کہیں کہیں کوئی روشنی ہے
جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے

کہاں ہے وہ اجنبی مسافر
کہاں گیا وہ اداس شاعر؟

و ہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

بہر کیف ناصر کاظمی نے اردو غزل کو اپنی جودت وندرتِ فکر وتخلیق

سے مالا مال کیا اور اسے موضوعاتی پامالی و یکسانیت سے باہر نکال کر رنگا رنگی سے متصف کیا، ان کی بدولت اردو غزل میں جدتِ تخیل اور وسعتِ تفکر کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ناصر کو پڑھ کر تازہ کار شعرا کی ایک پوری کھیپ تیار ہوئی۔ انھیں خود اندازہ ہو گیا تھا کہ اردو غزل کو وہ کیا کچھ دے رہے ہیں؛ چنانچہ متعدد مواقع پر انھوں نے بہ طور تحدیثِ نعمت اپنے اس احساس کا اظہار بھی کیا، ایک موقع سے کہتے ہیں:

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے!

کسی مناسبت سے یہ بھی کہا:

ہم سے روشن ہے کار گاہِ سخن
نفسِ گل ہے مشکبو ہم سے

اپنے انفرادو امتیاز کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زباں سخن کو، سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسے گا

نئے پیالے سہی تیرے دور میں ساقی
یہ دور میری شرابِ کہن کو ترسے گا

ناصر نے غزل پر لگنے والے الزامات کا دفاع بھی کیا، اس کی ایک شکل تو ان کی اپنی خوب صورت غزلیہ شاعری تھی اور دوسری شکل ناقدینِ غزل کو ان کا یہ چیلنج تھا:

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے
ناصر یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو!

ناصر کاظمی علم و مطالعہ کے انسان بھی تھے، اساتذۂ فن کا وسیع مطالعہ کیا تھا، میر، نظیر، ولی، انشا وغیرہ کی شاعری پر ان کی گہری نظر تھی اور ان کے انتخابات بھی مرتب کیے، مختلف قدیم و معاصر شعرا اور شعری موضوعات پر انھوں نے جو مضامین لکھے ہیں، وہ ان کی تنقیدی براعت اور سخن فہمی کی زبردست صلاحیت پر دال ہیں۔ ناصر کا پہلا شعری مجموعہ ''برگِ نے'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک کی غزلیں شامل ہیں، اس کے علاوہ ''دیوان''، ''پہلی بارش''، نظموں کا مجموعہ ''نشاطِ خواب''، منظوم ڈراما ''سر کی چھایا'' شائع ہوئے۔ ان تمام مجموعوں اور غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل کلیاتِ ناصر کاظمی بھی شائع ہو چکا ہے، جبکہ ان کا نثری سرمایہ ''خشک چشمے کے کنارے'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ ناصر کی زندگی اور ادبی و شعری امتیازات پر ان کے بہت سے معاصرین نے لکھا اور بعد میں انھیں باقاعدہ تحقیق کا موضوع بھی بنایا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حسن رضوی کی کتاب ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر'' اہم ہے۔ ۲۰۱۶ء میں ہندوستان میں ''ناصر کاظمی: حیات اور ادبی خدمات'' کے نام سے ڈاکٹر ناصر پرویز کی کتاب شائع ہوئی ہے، جو دراصل ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری پر معروف ناقد حامدی کاشمیری نے ساحل احمد کی فرمائش پر ایک مبسوط تنقیدی مقالہ لکھا تھا، جو پہلی بار ۱۹۸۲ء میں اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ ◆◆◆

مثنوی چراغِ دیر (مع پانچ اردو تراجم)

غالبؔ کی مثنوی ''چراغِ دیر'' مع پانچ اردو تراجم، اردو اکادمی، دہلی کی تازہ ترین کتاب ہے جسے ممتاز محقق، ناقد و شاعر اور دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر صادق نے مرتب کی ہے۔ آپ نے تلاش و تحقیق کے بعد اردو کے پانچ اہم ادیبوں کے ترجموں کو حاصل کیا ان میں ظ۔ انصاری، اختر حسن، علی سردار جعفری، حنیف نقوی اور کالیداس گپتا رضا کے تراجم ہیں۔ اختر اسن اور حنیف نقوی نے منظوم ترجمہ کیا ہے جب کہ بقیہ تین تراجم منثور ہیں۔ ''مثنوی چراغِ دیر'' مرزا اسداللہ خاں غالب کی فارسی شاعری کا ایسا شاہکار نمونہ ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ مرزا غالب نے یہ مثنوی سفر کلکتہ کے دوران بنارس میں قیام کے دوران لکھی تھی۔ پروفیسر صادق نے اس کام کو ایسے سلیقے سے انجام دیا ہے کہ اس مثنوی کی اہمیت دوبالا ہو گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ زیر نظر کتاب ریسرچ اسکالرز کی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

مرتب: پروفیسر صادق صفحات: ۱۰۸، قیمت: ۴۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی